کرتی رہی ہوں۔ میرے بھاگ اچھے تھے کہ میں نے اس لوک میں جنم لیا ہے۔ ایشور نے شاید میری آرزوئیں پوری کرنے کے لیے تمہاری پہلو میں بھیجا ہے''

پرتاپ چند: ''برجن! ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو کیا تم کو نہیں معلوم کہ میرا تم سے ہمیشہ سے پاک تعلق رہا ہے''

برج رانی: ''پیارے! ان خیالوں سے میرے ابھاگے دل کو تسکین نہیں ہوتی۔ پریم کی آگ نے ان سب خیالات کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ میں نے خیال کیا تھا کہ تم نظروں سے دور ہو جاؤ گے تو دل تمہیں بھول جائے گا میں نے دل کو بہت سمجھایا، مدتوں سے شعر و سخن سے جی بہلاتی رہی۔ تم آج بھی لوگوں کو میرے کلام کا مداح پاؤ گے۔ میں نے شہرت، عزت اور دولت سب پائی اور سب سے جی سیر ہو گیا۔ مگر تمہاری محبت کا نقش دل سے نہ مٹا۔ دوسرا جنم لے کر بھی اس آرزو میں گھلتی رہی۔ میں برسوں سے یہی سوچ رہی ہوں کہ تمہیں اپنی داستان غم سناؤں یا نہ سناؤں۔ کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر محبت میں روحانی طاقت ہے تو تم اور ہم ضرور ملیں گے۔ کبھی سوچتی تھی کہ تم مجھے بھول گئے ہو گے۔ مگر دل کو کسی طرح نہ سمجھا سکی۔ آج مجبور ہو کر میں نے شرم و حیا کو بالائے طاق رکھا اور تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔ تم میرے لیے جو مناسب سمجھو وہ کرو۔ میں تمہاری ہوں، خواہ مجھے اپنے پہلو میں جگہ دو، خواہ خیال میں بھی نہ لاؤ، میں تمہاری سیوا میں رہ کر تمہارے ساتھ رہ کر سب کچھ سہنے کو تیار ہوں۔ میرے پتا جی اس لوک کے راجہ ہیں، میرے سوا ان کے کوئی اولاد نہیں۔ مگر میں سب تیاگ دوں گی۔ میں تمہارے ساتھ فاقے کروں گی، کنوئیں سے پانی کھینچوں گی''

یہ کہتے کہتے برجن کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور گلا رندھ گیا

پرتاپ چند عجیب مخمصے میں مبتلا تھا۔ برجن نے اس کی محبت کا راگ گایا تھا اور یہ راگ سن کر کون مرد ہے جو مدہوش نہ ہو جائے

وہ ذرا دیر کے لیے بالکل بے کیف ہو گیا۔ سوچنے لگا آہ کیسی سچی محبت ہے، کیسی غیر فانی، کیسی پاکیزہ اور کیسی بے غرض، برجن تو سچ مچ دیوی ہے، تب انسانوں کی دیوی تھی اب دیوتاؤں کی دیوی ہے۔ تو میرے لیے یہ بہشت اور دولت اور یہ سکھ تیاگ دے گی۔ میں کیسے تیری اس محبت کی داد دوں کہ میں ان قربانیاں کے لائق نہیں ہوں۔

پرتاپ چند انہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ اتنے میں برجن نے نزاکت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی ''پیارے میں نے تم پر فیصلہ چھوڑ دیا ہے مگر دل کانپ رہا ہے کہ کہیں بے انصافی نہ کر بیٹھو (ہاتھ جوڑ کر) ایسا نہ کرنا! نہیں تو تمہاری برجن مر جائے گی۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتی میں تم سے محبت نہیں مانگتی تمہارا دل نہیں مانگتی میں تم سے صرف تمہارے ساتھ رہنے کی، تمہاری خدمت کرنے کی اجازت چاہتی ہوں، اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں مانگتی۔ تمہارا دل میرے مان کا نہیں۔ اسے لینے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میری محبت پر غرض ہے۔ حسن و شباب چند روزہ اور دولت فانی، تمہاری محبت غیر محدود ہے''

پرتاپ چند کے جی میں آیا کہ اس دیوی کے قدموں میں سر رکھ دوں۔ وہ کچھ جواب نہ دے سکا۔ برجن کی روحانی عظمت نے اسے بالکل پست کر دیا۔ قریب تھا، کہ اس خود فراموشی کے عالم میں اپنا برت بھول جائے کہ یکا یک سوامی برہمانند جی کا یہ قول یاد آیا۔

''ہر نیک اور اعلیٰ کام کے راستے میں بڑے بڑے سخت امتحانات کا سامنا ہوتا ہے۔ وہی پورا مرد ہے جو ان امتحانات سے بے داغ نکل جائے۔ بسا اوقات یہ امتحانات رنگ و روپ بدل کر آتے ہیں اس وقت ان سے مقابلہ کرنا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے''

اس خیال کے آتے ہی پرتاپ کا خیال کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ ضرور میں اس

وقت امتحان میں پڑا ہوا ہوں۔ وہی طاقت جو مجھے یونہی پرکھ رہی ہے۔ برجن کی زبان اور دل پر بھی اپنا جادو چلا رہی ہے۔ یہ خیال کرتے ہوئے اس نے جواب دیا ''برجن مجھ میں یہ بیان کرنے کی طاقت نہیں کہ اس وقت تم سے مل کر طبیعت کیسی خوش ہوئی مجھے فخر ہے کہ تم جیسی پاکیزہ اور صاف دیوی مجھ سے محبت رکھتی ہے اس محبت کے مقابلہ میں میری ہستی کی کچھ وقعت نہیں۔ کاش میں اس اہل ہوتا کہ اس اتھاہ پریم کی قدر کر سکتا۔ مجھ جیسا مٹی کا انسان تمہارے لائق نہیں۔ میں تمہاری پرستش کر سکتا ہوں۔ مگر محبت نہیں میں تمہارے قدموں کی خاک پیشانی پر مل سکتا ہوں مگر تمہاری پاکیزہ محبت کو اپنی بشریت سے آلودہ نہیں کر سکتا''

برج رانی کی آنکھوں سے آنسو کا دریا بہہ نکلا ذرا دیر کے بعد بولی ''تمہارا فیصلہ مجھے بسر و چشم منظور ہے۔ ایشور تمہیں سرسبز کرے۔ یہی میری دعا ہے، میرے لیے یہی خوشی کافی ہے کہ میری عزت اور محبت تمہاری دل میں موجود ہے۔ پرتاپ یقین مانو، میں صدق دلی سے اپنی خودغرضی پر نادم ہوں۔ محبت انسان کو خودغرض بنا دیتی ہے۔ یہ اس کا تقاضا ہے حالانکہ میں محبت کی طالب نہیں تھی میری یہ خواہش نہیں تھی کہ تمہاری محبت سے بہار زندگی لوٹوں۔ خیر نوشتہ تقدیر سے کیا چارہ! میری آخری التجا یہ ہے کہ اب میری یاد اپنے دل سے نکال ڈالنا۔ ایسا نہ ہو کہ کسی وقت میری یاد تمہیں ستائے اور رلائے۔ ہائے! تم رو رہے ہو۔ پیارے روؤ مت! ایشور کے لیے اپنے اوپر ایسا ظلم نہ کرو۔ ورنہ پچھتاؤ گے، تمہیں تجربہ ہو جائے گا کہ قوم کی خدمت اور محبت دل کے لیے کافی غذا نہیں ہے، تمہیں سب کچھ ملے گا۔ مگر برجن نہ ملے گی۔ مجھے پرماتما نے تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔ اسے کیا جواب دو گے''

پرتاپ نے روتے ہوئے جواب دیا ''برجن تمہاری تگیا مت توڑو تمہارے روبرو یوں کھڑا رہ کر میں اپنی پرتگیا پر قائم نہیں رہ سکتا۔ مجھے اب رخصت کر دو۔ میں جب تک زندہ رہوں گا۔ تمہاری یاد میرے دل سے نہیں نکل سکتی''

یہ کہتے کہتے وفور اشک سے اس کی زبان بند ہوگئی جب گھڑی خوب کھول جاتا ہے تو اس کا کھولنا اور بولنا بند ہو جاتا ہے۔ برج نے سر جھکا کر اسے پرنام کیا اور نظروں سے غائب ہوگئی۔

شام کا وقت تھا ہما چل سر پر سنہرا تاج رکھے کھڑا تھا۔ چڑیاں بسیرا لے رہی تھیں آسمان سے دو ایک شوخ ستارے گھورنے لگے تھے۔ پرتاپ چند نے دیکھا کہ برجن گیان سروور کے نیلگوں پانی میں کھڑی ہے۔ گویا جل دیوی اپنے سنگھاسن پر رونق افروز ہے اور ایسی آواز سے جس میں کوئل کی کوک، پپیہے کی ہوک اور رشیاما کی چہک ملی ہوئی ہے یہ دل سوز نغمہ الاپ رہی ہے۔

بن ہری کیوں راکھیں من دھیر
گھر آنگن نہ سہات رین دن بسیرے بھوجن نیر
بن ہری کیوں راکھیں من دھیر

مچھلیاں روتی تھیں اور پیڑ پتے سر دھنتے تھے۔ برجن کمر تک پانی میں چلی گئی اور پھر یہ آواز آئی۔

پن پن دہی سرت آوت، چت چیوت، جمنانیر
بن ہری کیوں راکھیں من دھیر

برجن نے پرتاپ چند کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑے۔ پھر گلے تک پانی میں چلی گئی۔ ایک کمل کھل گیا اور یہ آواز آئی

من اپجس آنہو سو اپنے کٹھن مدن کی پیر
بن ہری کیوں راکھیں من دھیر

چند تارے کان لگائے سن رہے تھے۔ آسمان کی سرخی مٹ چکی تھی۔ برجن نے پرتاپ چند کو پرنام کیا اور پانی میں غوطہ لگایا۔ پورنماشی کا چاند دیکھتے دیکھتے ڈوب گیا۔ پرتاپ دوڑا۔ پیر لڑکھڑائے اور بے ہوش ہوگیا۔

گنگا جمنا کا میلاپ

ہمارے ناظرین مادھوی کے نام سے غیر مانوس نہ ہوں گے جس طرح ایک سنگریزہ کسی پرفنکار کاریگر کے ہاتھوں میں موتیوں کے تول بکنے کے قابل ہو جاتا ہے، اسی طرح برج رانی نے مادھوی کو سکھا پڑھا کر اپنے ہی جیسا بنالیا تھا۔ اس کی خوش خلقی، نیک مزاجی اور شرافت کی دو ایک مثالیں برجن کے ان خطوط میں ملتی ہیں جو اس نے مجگاؤں سے کملاچرن مرحوم کے نام لکھے تھے۔ کبھی کبھی جنگلی پھولوں میں وہ باس بو اور رنگ روپ مل جاتا ہے جو سجی ہوئی روشوں اور مرصع کیاریوں کو بھی نصیب نہیں ہوسکتا مادھوی تھی تو ایک غریب جاہل برہمن کی لڑکی۔ مگر فطرت نے اسے جنس حسنہ کے کل پاکیزہ اوصاف عطا کیے تھے اور اس میں تعلیم وتربیت قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ مادھوی اور برجن کا ملاپ اس وقت ہوا جب سسرال آئی اس بھولی بھالی لڑکی نے اسی وقت سے برجن کے ساتھ غیر معمولی محبت ظاہر کرنا شروع کی۔ معلوم نہیں اسے دیوی سمجھتی تھی یا کیا۔ مگر کبھی اس نے برجن کی مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی نہ نکالا۔

برجن بھی اسے اپنے ساتھ سلاتی، کھلاتی اور پلاتی، اچھے اچھے ریشمی کپڑے پہنچاتی، اس سے زیادہ محبت وہ اپنی چھوٹی بہن سے بھی نہیں کرسکتی تھی۔

دل کو دل سے لگاؤ ہوتا ہے برجن کو سسرال میں آنے سے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ میں ہی پرتاپ چند کے خوابوں کی پری ہوں۔ اس کی ایک ایک نظر، ایک ایک بات میں وہ اپنی محبت کی جھلک دیکھتی اور افسوس کرتی۔ ایک روز جب کہ وہ کملاچرن کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے یہ خیال کر کے رونا آ گیا تھا کہ میری تو یوں لطف سے گزرتی ہے، بیچارے پرتاپ کے دل میں نہ جانے کیا بیت رہی ہوگی۔ مادھوی اس وقت گیارہویں سال میں تھی اور اس کے رنگ وروپ کا نکھار، سلیقہ، گفتگو اور گن

دیکھ کر سب کو حیرت ہوتی تھی۔ برجن کو معاً خیال آیا کہ مادھوی اس قابل نہیں کہ پرتاپ اسے اپنے گلے کا ہار بنالیں۔ اس دن سے وہ مادھوی کی تربیت اور خاطر داری میں اور بھی زیادہ منہمک ہوگئی۔ وہ سوچ سوچ کر دل میں پھولی نہ سماتی کہ جب مینا سولہ سترہ سال کی ہو جائے گی۔ اس وقت میں پرتاپ کے پاس جاؤں گی اور اس سے ہاتھ جوڑ کر کہوں گی کہ مادھوری میری بہن ہے۔ اسے آج سے اپنی چیری سمجھو۔ کیا پرتاپ میری اس بات کو ٹال دیں گے؟ نہیں ایسا وہ نہیں کر سکتے۔ مزہ تو تب ہے کہ خود مادھوی کو چچی اپنا بنانے کی مجھ سے استدعا کریں۔ اسی خیال سے برجن نے پرتاپ چند کے اوصاف حمیدہ کا نقش مادھوی کے دل میں جمانا شروع کر دیا تھا کہ اس کارواں رواں پرتاپ کی محبت میں سرشار ہو جائے۔ جب وہ پرتاپ چند کا بکھان کرنے لگتی تو خود بخود اس کے الفاظ غیر معمولی طور پر شیریں اور فصیح ہو جاتے۔ رفتہ رفتہ مادھوی کا بچہ دل چاشنی الفت کے مزے لینے لگا۔ آئینہ میں بال پڑ گیا۔

بھولی مادھوی سوچنے لگی میں کیسی خوش قسمت ہوں مجھے ایسا سوامی ملے گا۔ جس کے پیر دھونے کے لائق بھی میں نہیں ہوں مگر کیا وہ مجھے اپنی چیری بنائیں گے۔ کچھ ہو، میں ضرور ان کی بنوں گی اور پریم میں کچھ کھچاؤ ہے تو بھی میں انہیں ضرور اپنا لوں گی۔ مگر اس غریب کو کیا معلوم تھا کہ یہ آرزوئیں حسرت بن کر آنکھوں کے راستہ بہہ جائیں گے۔ اس کا پندرھواں سال پورا ابھی نہ ہوا تھا کہ برجن پر خانہ تباہی کے صدمے آپڑے۔ اس طوفان نے جو کسر رکھ چوڑی تھی۔ وہ اس آگ نے جلا کر راکھ کر دی۔

مگر خیال کوئی چیز ہے تو مادھوی پرتاپ چند کی بیوی بن چکی۔ اس نے اپنا تن اور من انہیں سونپ دیا۔ پرتاپ کو خبر نہیں مگر آج اسے ایسی بیش بہا چیز ملی ہے جس کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں ٹھہری سکتی۔ مادھوی نے صرف ایک بار پرتاپ کو دیکھا اور

صرف ایک بار اس کی امرت کی سی باتیں سنیں تھیں ۔مگر برجن کی شیریں بیانیوں نے اس کے سینہ میں آگ کی وہ چنگاری ڈال دی تھی جو روئی کے تودے میں گھس کر اسے جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ پرتاپ کا پتہ نہیں ہے مگر مادھوری اس کی پرزور محبت میں روز بروز گھلتی جاتی ہے۔اس دن سے کوئی ایسا برت نہیں تھا جو مادھوی نہ رکھتی کوئی ایسا دیوتا نہیں تھا جس کی وہ پوجا نہ کرتی ہو اور یہ سب اس لیے کہ پرتاپ کو ایشور جہاں کہیں بھی ہو، خیریت سے رکھے۔ان خیالات نے اس لڑکی کو اور بھی زیادہ متین، نیک مزاج اور شریف بنا دیا۔شاید اس کے دل نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میرا بیاہ پرتاپ چند سے ہو چکا۔ برجن اس کی یہ حالت دیکھتی اور روتی کہ یہ آگ میری ہی لگائی ہے۔اب یہ گل نورس کس کے گلے کا ہار بنے گا۔وہ کس کی ہو کر رہے گی ہائے! جس بیج کو میں نے اتنی محنتوں سے اگایا اور شہد اور دودھ سے سینچا۔اس کا پھول شاخ پر کملا جاتا ہے! برجن تو خیر شعر وسخن میں الجھی رہتی۔یہی باغیچہ اس کا ہمدم اور خیال یار تھا۔ اس کا یار جواب تک اس کے لیے بیگانہ محض تھا ایک روز پرتاپ کے چلے جانے کے بعد خواب دیکھا کہ وہ سنیاسی ہو گیا ہے۔آج مادھوی کا اتھاہ پریم ظاہر ہوا۔اسے الہام سا ہو گیا کہ پرتاپ نے ضرور سنیاس لے لیا آج سے وہ تپسونی بن گئی۔ذاتی آرام وآرائش کا خیال دل سے جاتا رہا۔

جب کبھی بیٹھے بیٹھے مادھوی کا جی گھبراتا تو وہ پرتاپ چند کے گھر جا بیٹھتی۔وہاں اس کے دل کو ذرا تسکین ہو جاتی تھی۔ جب سے سہاما کو برجن کے خطوط کا بیاض ملا تھا۔اس کی زندگی نے عجیب روش اختیار کر لی تھی۔غرور حسنہ اس کے اوصاف کا خاص رکن تھا۔اس نے اپنی پیشانی پر بل تک نہ آنے دیا تھا۔زبان سے افسوس و ملال کا ایک لفظ نہ آنے دیا تھا اور آنکھوں سے حسرت کے آنسو بہنے پائے۔حسب معمول ٹھیکہ کا کاروبار کرتی رہی بلکہ اب اور بھی مصروفیت اور انہماک کے ساتھ ہاں اب بجائے بخیلانہ کفایت شعاری کے مزاج میں فراخدلی آ گئی تھی یہ مکان، مادھوی

کے لیے ایک پاک مندر تھا۔ جب تک برجن اور سبھا کے دلوں میں گانٹھ پڑی ہوئی تھی وہ یہاں بہت کم آتی تھی۔

مگر جب آخر کار برجن کی پاکیزہ شاعری، پاکیزہ خیالات اور پاکیزہ طرز زندگی نے دونوں عورتوں کے دلوں کی گانٹھ کھول دی اور وہ گنگا جمنا کی طرح باہم گلے مل گئیں تو مادھوری کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی۔ سبھا کے پاس دن کے دن بیٹھی رہ جاتی۔ اس گھر کی ایک ایک انگل زمین پرتاپ چند کی یادگار تھی۔ اسی آنگن میں بالا جی نے کاٹھ کے گھوڑے دوڑائے تھے اور اسی حوض میں کاغذ کی ناویں چلائی تھیں۔ ناویں تو شاید زمانہ کے بھنور میں پڑ کر ڈوب گئیں۔ مگر گھوڑا اب بھی موجود تھا۔ مینا نے اس کی بوسیدہ ہڈیوں میں جان ڈال دی اور اسے باغیچہ میں حوض کے کنارے ایک گلاب کے سایہ میں باندھ دیا۔ یہی کمرہ بالا جی کی آرام گاہ تھا۔ مادھوی اسے اب اپنے دیوتا کا مندر سمجھتی تھی۔ اسی پلنگ نے بالا جی کو مدتوں تک اپنی آغوش میں تھپک تھپک کر سلایا تھا مادھوی اسے اب پھولوں سے سجاتی تھی۔ کیا پلنگ نے ایسے دن بھی دیکھے تھے۔ مادھوی کی اس ہمہ گیر محبت سے سبھا کا کفر ٹوٹ گیا۔ مدت سے اس کی زبان پر پرتاپ کا کبھی نام نہیں آیا تھا۔ برجن سے میل جول بھی ہو گیا۔ مگر دونوں عورتوں میں پرتاپ کا ذکر کبھی نہیں آیا تھا۔

حیا برجن کی دامن گیر تھی اور خودداری سبھا کی، مگر مادھوی کے شعلہ محبت نے پتھر کو بھی پگھلا دیا تھا جب وہ خود رفتگی کے عالم میں پرتاپ کے بچپنے کی باتیں پوچھنے لگتی تو سبھا سے ضبط نہ ہوتا۔ اس کی آنکھیں بھر آتیں۔ تب وہ دونوں کی دونوں راتیں روتیں اور دن بھر ان کی باتیں ختم نہ ہوتیں۔ کیا اب بھی مادھوی کا حال دل سبھا سے چھپ سکتا تھا۔ وہ اکثر سوچتی کہ کیا یہ تپسونی یوں ہی محبت کی آگ میں جلتی رہے گی اور بنا کسی امید کے!

آٹھ نو سال بیت گئے۔ ایک روز برج رانی نے کملا کا پیکٹ کھولا تو سرورق پر ایک

نہایت پر جلال تصویر کئی رنگوں میں بنی ہوئی نظر آئی یہ کسی مہاتما کی تصویر تھی۔ اسے خیال آیا کہ میں ن ان مہاتما کو کہیں ضرور دیکھا ہے سوچتے سوچتے یکا یک اس کا خیال پرتاپ چند تک جا پہنچا۔ فرط مسرت سے اچھل پڑی اور بولی۔ ''مادھوی ذرا یہاں آجاؤ''

مادھوی پھولوں کی کیاریاں سینچ رہی تھی۔ اس کے دل کے بہلاؤ کا آج کل یہی مشغلہ تھا۔ ساڑھی پانی میں لت پت، سر پر بال بکھیرے، ماتھے پر پسینہ کی بوندیں اور آنکھوں میں پریم کا رس، آ کر کھڑی ہوگئی۔ برجن نے کہا'' آ تجھے ایک تصویر دکھاؤں''

مادھوی: ''کس کی تصویر ہے دیکھوں''

مادھوی نے تصویر کو بغور دیکھا اور آبدیدہ ہوگئی۔

برجن: ''پہچان گئی''

مادھوی: ''کیوں؟ یہ شکل میں کئی بار خواب میں دیکھ چکی ہوں، چہرے سے تیج برس رہا ہے''

برجن: ''دیکھو کچھ حالات بھی لکھے ہیں''

مادھوی نے دوسرا ورق الٹا ''سوامی بالاجی'' کی سرخی نظر آئی

تھوڑی دیر کے لیے دونوں کی دونوں خاموش اور محویت کی تصویر بنی ہوئی یہ مضمون پڑھتی رہیں۔ بعد ازاں بات چیت ہونے لگے۔

برجن: ''میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ انہوں نے ضرور سنیاس لے لیا ہوگیا''

مادھوی زمین کی طرف تاکتی رہی مگر منہ سے کچھ نہ بولی

برجن: ''تب اور اب میں کتنا فرق ہے؟ چہرہ پر جلال برس رہا ہے تب ایسے وجیہ نہ تھے''

مادھوی: ''ہوں''

برجن: ''ایشوران کی مدد کرے، بڑی تپسیا کی ہے (آبدیدہ ہوکر) کیا اتفاقات ہیں، ہم اور وہ ساتھ کھیلے، آج وہ سنیاسی ہیں اور میں بیراگن، نہ جانے انہیں ہم لوگوں کی سدھ بھی ہے یا نہیں۔ جس نے سنیاس لے لیا، اسے کسی سے کیا ناطہ، جب چچی کے پاس ایک خط نہ لکھا تو بھلا ہمار کیا یاد باقی ہوگی مادھوی! بچپنے میں وہ کبھی جوگی جوگی کھیلتے تو میں مٹھائیوں کی بھکشا دیا کرتی تھی''

مادھوی نے رو کر کہا ''نہ جانے کب درش ہوں گے'' یہ کہہ کر شرم سے سر جھکا لیا

برجن: ''جلد آئیں گے، راجہ دھرم سنگھ اور بھیا دونوں انہیں ضرور لائیں گے''

مادھوی: ''ان دونوں نے بڑے حوصلے کا کام کیا ہے''

برجن: ''کیسا کچھ! راجہ صاحب یہاں سے سیر کرنے گئے تھے۔ شاید خطاب کی آرزو کھینچ کر لے گئی تھی۔ ان کی جائیداد دو کروڑ سے کم نہیں۔ پچاس لاکھ تو سالانہ نفع ہے۔ ان کا اس فراخدلی سے ساری جائیداد کار توقف کار خیر میں وقف کر دینا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی بھی ارپن کر دینا بڑا بھاری تیاگ ہے۔ بھیا نے بھی کل کا نام روشن کر دیا۔ مجھے ان کی طرف سے ایسی امید نہ تھی''

مادھوی: ''چندرا بہن آتی ہوں گی''

برجن: ''ہاں اب وہاں کیا کریں گی، انہیں بھیا کا کام شاید ہی پسند نہ آیا ہو، جھلاتی ہوئی آتی ہوں گی''

مادھوی: ''درشنوں کو لوگ بہت بہت دور سے آئے تھے''

برجن: ''تقریر کی کیسی تعریف کی ہے، ان کی زبان میں تو پہلے ہی جادو تھا۔ اب کیا پوچھنا بھیا کی تقریر کا جس کے دل پر ایسا اثر ہو وہ ساری دنیا پر اپنا جادو پھیلا سکتا ہے''

مادھوی: ''چلو چچی کے یہاں چلیں''

برجن: ''ہاں ان کا تو خیال ہی نہیں، دیکھیں کیا کہتی ہیں، خوش تو کیا ہوں گی''

مادھوی: ''ان کی تو بھلا بھلا کھا ہی یہ تھی، خوش کیوں نہ ہوں گی''

برجن: ''چل ماں یہ خبر سن کر کبھی خوش ہو سکتی''

دونوں عورتیں گھر سے باہر نکلیں۔ دونوں حسن کی رانیاں تھیں۔ برجن کو دیکھ کر اکثر آدمی سر تعظیم خم کرتے تھے۔ لوگ فرط ادب سے اس کے سامنے سے ہٹ جاتے۔ خاص و عام میں اس کی یکساں عزت تھی۔ کوئی مادھوی سے پوچھے تیرے پیر اب زمین پر کیوں نہیں پڑتے۔ تیرے زرد چہرے پر کیوں مسرت کی سرخی جھلکا کرتی ہے۔ تجھے کونسی دولت مل گئی ہے۔ تو اب متفکر اور مغموم نظر نہیں آتی۔ تجھے اپنے پتیم سے ملنے کی اب کوئی امید نہیں۔ تجھ پر محبت کی نگاہیں کبھی نہیں پڑیں۔ تیرے کانوں میں محبت کی آوازیں کبھی نہیں پڑیں۔ پھر تو کیوں پھولی نہیں سماتی۔ اس کا جواب مادھوی کیا دے گی۔ کچھ نہیں، وہ سر جھکا لیتی اور اس کی آنکھیں نیچے جھک جائیں گی جیسے پھولوں کے بوجھ سے شاخیں نیچے جھک جاتی ہیں اور شاید آنسو کے چند قطرے ٹپک پڑیں۔ مگر اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلے گا۔

مادھوی محبت کے نشہ سے متوالی ہے۔ اس کا دل دیوانہ محبت ہے۔ اس کی محبت بازار کا سودا نہیں، اس کا پریم کسی چیز کا بھوکا نہیں۔ وہ محبت کے عوض نہیں چاہتی۔ اسے ناز ہے کہ ایسے پاک منش آدمی کی صورت میرے دل میں جلوہ گزیں ہے اور یہی اس کی دیوانگی، اس کے پریم اور اس کے عشق کا صلہ ہے۔

دوسرے مہینے میں برج رانی نے بالا جی کے خیر مقدم میں ایک پر زور نظم لکھی۔ یہ شاعرانہ معجزہ تھا۔ جب یہ نظم شائع ہوئی تو علمی دنیا باوجود برجن کی روز افزوں بلند پروازیوں سے مانوس ہونے کے حیرت میں آ گئی۔ وہ طائر فکر جو شاعری کے آسمان میں کرہ ہوا سے بھی آگے نکل جاتا، اب کی بار تارا بن کر چمکا۔ ایک ایک شعر الہامی روشنی سے منور تھا۔ جن لوگوں نے وہ نظم پڑھی۔ بالا جی کے فدائی ہو گئے۔ شاعر وہ شعبدہ باز ہے جس کی پٹاری میں بجائے سانپوں کے دل بند ہوتے ہیں۔

تاریخ کا ایک ورق

ناظرین! بالا جی کے قومی کارنامے آپ کو تاریخ کے صفحوں میں آب زر سے لکھے ہوئے ملیں گے۔ ہم نے ان صفحات میں ان حالات اور واقعات کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ جس اس کارنامے کے محرک ہوئے۔

کسی گری ہوئی قوم کو ابھارنا بہت مشکل کام ہے۔ مگر اس کا صلہ بھی ساری دنیا کی دولت سے زیادہ گرانبار اور بیش قدر رہوتا ہے۔ بالا جی کے نام پر آج مورخ کا قلم وجد کرنے لگتا ہے۔ سعراء اس کے نام پر بلند پروازیوں کے موتی نثار کرتے ہیں۔ ملک کے در و دیوار اس کا جس گا رہے ہیں۔ اس کا ذکر کرتے ہی لوگوں کے سر تعظیم سے جھک جاتے ہیں اور دل قومی جوش سے لبریز ہو جاتے ہیں۔

کسی گری ہوئی قوم کو ابھارنا آسان کام نہیں مگر اس کا صلہ جنت کی نعمتوں سے بھی زیادہ حیات بخش ہوتا ہے۔ بچے ماں کی گود میں بالا جی کے کارنامے سنتے ہیں۔ اس کی یاد دلوں میں حوصلہ اور بازوؤں میں قوت پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے نام کی بستیاں بس رہی ہیں اور درسگاہیں کھل رہی ہیں۔ اس نام پر زبانیں فصاحت کے پھول چڑھا رہی ہیں۔ امراء اپنے محلوں اور غرباء اپنی جھونپڑیوں میں اس کے گن گاتے ہیں۔ اس کی صورت آنکھوں سے نہیں اترتی۔ اس کی پر زور اور پر حوصلہ آواز اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ اس کے خیالات آنے والی نسلوں کے دماغ سنواریں گے اور صدیوں تک اس کے ہم وطنوں کے لیے گنبد نور کا کام دیں گے۔

دیکھیے ایک بے یار و مددگار شخص قوم کو ابھارنے میں کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کام کے راستہ میں دولت کی اور مددگار کی کمی حائل نہیں ہو سکتی۔ روحانی قوت، دردمند دل، وسیع ہمدردیاں، یہ ضروری سامان ہے۔ ابھی بہت دن نہیں گزرے کہ پرتاپ چند ایک گمنام آدمی تھا۔ آج اس کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ کیا اس کے پاس قارون کا خزانہ تھا۔ پنگھٹ پر جب عورتیں کولہوں پر گھڑے رکھے

پانی لینے آتی ہیں۔تب بالا جی ہی کے چرچے ہوتے ہیں اور انہیں کے جس گائے جاتے ہیں۔اناج کے کھیتوں میں انہیں کی بڑائی ہوتی ہے۔یہی قومی خدمت گزاری کا انعام ہے۔

کلکتہ میں جب وہ گئے تو پھولوں کی برکھا ہوئی۔ ہزاروں من پھول پیروں تلے روند ڈالے گئے۔اس دن مندروں میں دیوتاؤں کو پھول کی باس نہ ملی۔ رنگین مزاجوں کے گلے میں پھولوں کے گجرے نہ دکھائی دیئے اور حسینوں کی سجس پھولوں سے نہ سجائی جاسکیں۔مگر بالا جی کو اس نمائش اور دھوم دھام سے مطلق دلچسپی نہ ہوئی۔ دوسرے دن جب وہ بھاگیرتھی کے کنارے پانی میں غروب آفتاب کی بہار دیکھ رہے تھے تو کئی عورتیں پانی بھرنے آئیں اور گھڑوں کو پانی میں گھما گھما کر باتیں کرنے لگیں۔

ایک نے کہا: ''بہن تو نے سنا نہیں بالا جی آئے ہیں''

دوسری بولی: ''ہمارے ایسے بھاگ کہاں جو ان کے درشن ملیں''

تیسری بولی: ''تو چلنے پر راضی ہو تو میں تیرے ساتھ چلوں، وہ آج اپنی گئوشالہ دیکھنے آئیں گے۔کون دور ہے۔ مجھے گئوؤں کے لیے کھلی اور دانہ بھی لے جانا ہے۔ایک پنتھ دو کاج ہو جائیں گے''

چوتھی بولی: ''ایسے دیوتا کے درشن کریں گی تو بڑا پاپ ہوگا۔دیکھ جب سے ان کا گئوشالہ کھلا ہے۔بچوں کو دونوں وقت دودھ پینے کو مل جاتا ہے۔نہیں تو روٹیوں کو ترستے تھے۔''

بالا جی نے یہ باتیں سنیں اور بھاگیرتھی کے گلنار پانی کی طرح چہرہ سرخ ہو گیا۔ انہوں نے گاؤں گاؤں گئوشالے کھول دیئے تھے۔ان کا سدھانت تھا کہ ہماری قوم کی تباہی اور زوال کا اصلی سبب ہمارا جسمانی ضعف اور ذاتوں کی بے جا تفریق ہے۔اور جب ہمارے بچے روکھی روٹیوں کو ترستے ہیں اور دودھ گھی کی تفریق خوشبو

بھی ان کے ناک تک نہیں پہنچتی تو کوئی تعجب نہیں کہ ان کے قویٰ ایسے ضعف اور ذلتوں کی ایسی بے جا تفریق، چہرے ایسے پژمردہ اور اعضا ایسے کمزور ہیں۔ بلند ارادے اور اونچے خیالات، چوڑے سینوں اور مضبوط کلائیوں میں رہا کرتے ہیں۔ جب قوائے جسمانی کا یہ حال ہے تو خیالات کیسے اڑیں۔ استقلال کہاں سے آئے۔ جرأت کہاں سے پیدا ہو اور پھول کیسے کھلیں۔ جب جڑ کو غذا نہیں پہنچتی تو پھل کہاں سے آئیں۔ جب پیڑ سوکھ جائیں تو زمین تر کر دو۔ اس میں پانس ڈال دو۔ پھر دیکھو کہ کیسے خوشنما اور خوشبودار پھل کھلتے ہیں۔ اور کیسے لذیذ اور رسیلے پھل لگتے ہیں، جسمانی صحت ضعف سے زیادہ مہیب قومی دشمن اور شرمناک ترقی کی حالت حقارت ہے۔ جس سے ہم اپنے بھائیوں کو دیکھتے ہیں۔ ہم نے اونچی اور نیچی ذاتیں مقرر کر رکھی ہیں اور فطرت کے اس زبردست قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہیں کہ خلقت ترقی کرتی ہوئی اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچتی ہے۔ آج تک جتنے رشی، مہاتما ہو گزرے ہیں ان سبھوں نے آریہ ورت سے اس تفریق کو مٹانے کی کوششیں کی ہیں۔ مہاتما بدھ وہ پہلے بزرگ تھے جنھوں نے ہندوؤں کی پیشانی پر سے اس بے انصافی اور ظلم کے داغ کو مٹانا چاہا اور انہیں بہت کچھ کامیابی ہوئی۔ ان کے بعد شری شنکر، شری رامانج، شری چیتن تھے۔

شری رام کرشن، سوامی دیانند جی اور سوامی رام تیرتھ سبھی مہاتماؤں نے یہی تعلیم دی کہ اپنے بھائیوں کو اپنا بھائی سمجھو۔ جاہل بھائی بھی تمہارا بھائی ہے۔ اسے حقیر مت سمجھو۔ تمہاری نجات اتفاق سے ہوگی، تفریق سے نہیں۔ جو شخص اپنے ہم وطنوں پر حقارت کی نگاہ ڈالتا ہے، وہ کبھی ترقی کے زینہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ پیارو! جب تک ایک برہم چمار کے سامنے سر تعظیم جھکانا نہ سیکھے گا، اس وقت تک قوم کی ناؤ ہرگز پار نہ لگے۔ یقین مانو تمہاری ناؤ جگہ سے ایک انگل بھی نہ ٹلے گی۔ تمہارے ڈانڈے ٹوٹ جائیں گے۔ تمہارے بادبان پھٹ جائیں گے اور تمہارے ملاح ہانپ ہانپ کر

بیدم ہو جائیں گے۔

یہ بالا جی کے خیالات ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ ورنہ ہندوستان کے لیے کیا کچھ نہ کر جاتے۔ تاہم جو کچھ انہوں نے کیا اس پر ہر ایک ہندوستانی فخر کر سکتا ہے۔ ایسا کون سا گاؤں ہے جہاں بالا جی کا گئو شالہ نہ قائم ہو۔ ہندوستان کی چپہ چپہ زمین کو انہوں نے اپنے قدموں سے روشن کیا۔ پونا، بمبئی، مدارس، میسور، کٹک، گجرات جیسے دور دراز شہروں میں مہینوں رہے اور اپنی بلند آواز سے سوئی ہوئی آتماؤں کو جگاتے رہے۔ چھ ہفتہ کی کوشش میں انہوں نے میسور میں تین ہزار گئو شالے کھلوا دیے۔ آفتاب کی چمک سے پانی میں ایسی چمک آ جاتی ہے کہ آنکھیں نہیں ٹھہرتیں۔ بالا جی کا جوش اور حوصلہ دوسروں کو سرگرم، پر جوش اور حوصلہ مند بنا دیتا تھا۔ جہاں جہاں بالا جی نے گئو شالے قائم کیے، وہاں خود بخود اکھاڑے بن گئے۔ خم کی خوش آئند صدائیں صبح کو مبارکباد دیتی ہیں اور للکار کی پر جوش آوازیں درختوں کو نیند سے جاتی ہیں۔ ذات کی باہمی تفریق مٹانے کے لیے انہوں نے زبردست کوششیں کیں۔ وہ صفحہ تاریخ کے لیے ہمیشہ باعث ناز رہیں گی۔ وہ مبارک گھڑی تھی جب انہوں نے پٹنہ میں ارجن سبھا کی بنیاد ڈالی۔ تین سال کے اندر ایسا شاید ہی کوئی شہر یا گاؤں تھا جہاں ارجن سبھا کی شاخیں نہ کھلی ہوں۔ انہیں ارجن سبھاؤں کی کوششوں کا پھل ہے کہ آج ہر قصبہ میں نیچی ذاتوں کے لیے جدا جدا مدرسے۔ جدا جدا بورڈنگ ہاؤس قائم ہیں۔ ارجن سبھا کے ممبران مدرسوں میں تعلیم دیتے ہیں اور ان ذاتوں کے تمدن اور معاشرت کے عیوب کی اطلاع کرتے ہیں۔ یہ لوگ گاؤں گاؤں گھومتے ہیں اور ہندو قوم کے مظلوموں کو بیداری کا مژدہ سناتے ہیں۔ ان سے بھائیوں کی طرح بغلگیر ہوتے ہیں اور ان کے دلوں میں خودداری کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ مبارک اور جان بخش ہوتا تھا، وہ نظارہ جب بالا جی نے اپنے مظلوم بھائیوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر ان کا دل اور

حوصلہ بڑھانے کی باتیں کرتے ہیں۔آج بالا جی کا نام سن کر یہ لوگ پھولے نہیں سماتے تھے۔ان لوگوں میں اخلاق و عادات کو سدھارنے کی جو کوشش آپ دیکھتے ہیں۔یہ بالا جی ہی کی جانفشانیوں کا نتیجہ نیک ہے۔

ہمارے قومی کاموں کا ایسا کوئی جز نہیں ہے جو بالا جی کی عنایت کا ممنون نہ ہو۔ ان کا وقت، ان کا دھیان، ان کی سرگرمی اور ان کا سب کچھ قوم کی خدمت کے لیے وقف تھا۔وہ قوم کے سرتاج اور قوم کے چاکر دونوں ہی تھے۔

26

بنارس میں آمد

جب سے شہرت نے برج رانی کو اپنا منظور نظر بنایا۔اس کے یہاں ہر دم عورتوں کا جمگھٹ لگا رہتا تھا۔شہر میں مستورات کی کئی سبھائیں تھیں۔ان کے متعلق سارا بوجھ اسی کو اٹھانا پڑتا۔اس کے علاوہ دوسرے شہروں سے اکثر عورتیں اس کی ملاقات کو آتی رہتی تھیں۔جو تیرتھ جاترا کرنے کے لیے بنارس آتا تھا وہ برجن سے ضرور ملاقات کو آتا تھا۔

برج رانی کے کلام کا مجموعہ بڑی آب و تاب سے شائع کیا تھا اور اس مجموعہ نے اس کی شاعرانہ سطوت کا ڈنکا بجا دیا تھا۔ہندوستان کا تو کیا شمار یورپ اور امریکہ کے سربرآوردہ شعرا نے بھی اسے اس کے محاسن کلام پر مبارکباد دی۔ہندوستان میں شاید ہی ایسا کوئی خوش مذاق شخص ہوگا جس کی کتابوں کا شیلف اس دیوان سے آراستہ نہ ہو۔اور برجن کے کلام کی قدر کرنے والوں میں بالا جی کا درجہ سب سے بڑھا ہوا تھا۔وہ اپنی پرزور تقریروں اور تحریروں میں اسی کے کلام کی سندیں دیا کرتے تھے۔اور ایک بار سرسوتی میں اس کی پرزور تنقید لکھی تھی۔

ایک روز برجن صبح کے وقت بیٹھی ہوئی تھی کہ سیتا، چندکنور، رکمنی اور رانی آئیں۔ چندکنور زیوروں سے لدی ہوئی تھی۔سیتا متبینا و رخاموش، رکمنی کا چہرہ پژمردہ اور

الوداع شباب کی تصویر اور رانی ناک چوٹی سے درست عطر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ چندرا نے ان عورتوں کو فرش پر بٹھایا اور ان کی خاطر مدارت کی۔ برجن نے صبح کا وقت فکر سخن کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ اس وقت وہ بلا کسی ضرورت کے سکھیوں سہیلیوں سے نہ ملتی جلتی تھی۔ باغیچہ میں ایک خوبصورت کنج تھا۔ چندرا نے ان عورتوں کو فرش پر بٹھایا اور ان کی خاطر مدارت کی۔ برجن نے صبح کا وقت فکر سخن کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ اس وقت وہ بلا کسی ضرورت کے سکھیوں سہیلیوں سے نہ ملتی جلتی تھی۔ باغیچہ میں ایک خوبصورت کنج تھا۔ گلاب کی خوشبو سے بسی ہوئی ہوائیں آتی تھیں۔ وہیں برجن ایک قالین پر بیٹھی ہوئی فکر سخن کیا کرتی تھی۔ اور بحر معنی سے جو وہ موتی نکالتی اسے مادھوی پرویا کرتی۔ آج بہت دنوں کے بعد اور اہل شہر کے متواتر تقاضوں پر برجن نے بالاجی پر قلم اٹھایا تھا۔ بنارس ہی وہ شہر تھا جس کی یاد کبھی کبھی بالاجی کو بے چین کر دیا کرتی تھی۔ مگر باوجود اہل بنارس کے مسلسل دعوت اور اصرار کے انہیں بنارس آنے کی کبھی فرصت نہ ملی۔ سیلون اور رنگون تک گئے بنارس کی طرف رخ نہ کیا۔ اس شہر کو وہ امتحان کدہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے آج برجن انہیں بنارس آنے کی دعوت دے رہی تھی۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دعوت انہیں ضرور کھینچ لائے گی۔ جب کوئی تازہ خیال آتا تو برن کا چاند سا چہرہ چمک اٹھتا۔ اور مادھوی کے چہرے پر سرخی کی جھلک آجاتی۔ باغیچہ میں گلاب کے بہت پھول کھلے ہیں۔ رات کی شبنم میں نکھر کر وہ اس وقت بہت سہانے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اس وقت جو تازگی اور سہانا پن ان دونوں پھولوں پر ہے، اسے دیکھ کر دوسرے پھول شرمائے جاتے ہیں۔ دونوں پھول باغ فردوس کے پھول ہیں۔

مگر نہیں ہم بھولتے ہیں۔ ایسے حسن دلآویز کو پھول سے کیا نسبت، پھول میں وہ دلآویزی کہاں۔ وہ رس کہاں اور وہ کشش کہاں۔ کسی نے ایسا پھول دیکھا ہے جسے دیکھنے سے کبھی آنکھیں آسودہ نہ ہوں اور دیکھنے کی ہوس باقی رہے۔ ایسا پھول کہاں

ہے جسے دیکھ کر ایک بجلی سی کوند جائے۔ جس کی صورت دل پر نقش ہو جائے۔ شعراء نے پھول کا رتبہ بڑھا رکھا ہے۔ پھر کیا اس حسن کو چاند سے تشبیہ دیں آہ! یہاں بھی شاعروں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ چاند میں وہ دلفریبی کہاں۔ چاند میں روشنی ہے چمک ہے، مگر حسن کہاں۔ کیا چاند بھی ایسی چیز ہے جسے دیکھنے سے جی نہ بھرے۔ کیا چاند بھی جگر کو مسوسنے لگتا ہے۔ کیا چاند کو دیکھ کر بھی روح پر ایک نشہ سا چھا جاتا ہے۔ حق یہ ہے کہ حسن کی تشبیہ دنیا کی کسی چیز سے نہیں دی جا سکتی۔ کسی چیز میں یہ کشش، یہ اثر، یہ دلآویزی نہیں۔

نو بجتے بجتے برجن کمرہ میں آئی سیوتی بولی ''آج بڑی دیر لگا دی ہے''

برجن: ''گنتی نے سورج کو بلانے کے لیے کتنی تپیا کی تھی''

سیتا: ''بالاجی بڑے نٹھر ہیں، میں تو ایسے آدمی سے کبھی نہ بولوں''

رکمنی: ''جس نے سنیاس لے لیا اسے گھر بار سے کیا ناطہ''

چندر کنور: ''یہاں آئیں گے تو میں منہ پر کہہ دوں گی کہ حضرت یہ معشوقانہ انکار کہاں سے سیکھا؟''

رکمنی: ''مہارانی رشی مہاتماؤں کا تو ادب کیا کرو، زبان کیا کترنی ہے؟''

چندر کنور: ''اور انہیں کب تک صبر کریں گے جی، سب جگہ جاتے ہیں یہیں آتے پیر تھکتے ہیں''

برجن: ''(مسکرا کر) اب بہت جلد درشن پاؤ گی۔ مجھے یقین ہے کہ اس مہینہ میں ضرور آئیں گے''

ستیا: ''دھنیہ بھاگ کہ درشن تو ملیں گے۔ میں تو جب ان کا حال پڑھتی ہوں تو یہی جی چاہتا ہے کہ پا جاؤں تو گھنٹوں پاؤں پکڑ کر روؤں''

رکمنی: ''ایشور نے ان کے ہاتھ میں بڑا جس دیا۔ دارانگر کی رانی صاحبہ مر ہی چکی تھی۔ یقین مانو دم ٹوٹ رہا تھا کہ بالاجی کو خبر ہوئی۔ فوراً پہنچے اور دم کی دم میں اٹھا کر

بٹھا دیا۔ ہمارے منشی جی (شوہر) ان دنوں وہیں تھے۔ کہتے تھے کہ رانی جی نے خزانہ کی کنجی لے کر بالا جی کے پیروں پر رکھ دی اور کہا'' آپ اس کے مالک ہیں بابو جی نے خزانہ کی کنجی نہ لے کر کہا'' مجھے خزانہ درکار نہیں، آپ اپنی ریاست میں تین گئو شالے کھلوا دیجیے'' زبان سے نکلنے کی دیر تھی آج دارا انگر میں دودھ کی ندی بہتی ہے۔ ایسا مہاتما کون ہوگا

چندر کنور: ''راجہ نولکھا کا تپ دق انہیں کی بوٹیوں سے چھوٹا۔ سارے حکیم ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ جب بالا جی چلنے لگے تو مہارانی صاحبہ نے نولکھ کا موتیوں کا ہار ان کے پیروں پر رکھ دیا۔ مگر اس کی طرف دیکھا تک نہیں''

رانی: ''عجیب مردہ طبیعت کے ہیں''

رکمنی: ''ہاں اور کیا، انہیں چاہیے تھا کہ ہار لیتے بلکہ گلے میں ڈال لیتے''

برجن: ''نہیں لے کر رانی کو پہنا دیتے کیوں سکھی؟''

رانی: ''ہاں میں اس ہار کے لیے غلامی لکھ دیتی''

چندر کنور: ''ہمارے یہاں تو ارجن سبھا کے ممبر بن بیٹھے ہیں۔ ڈھائی سو روپیہ لاکھ جتن کر کے جوڑا تھا۔ اسے اٹھا لے گئے کہ گھوڑا لیں گے، کیا ارجن سبھا والے بلا گھوڑے کے نہیں چلتے''

رانی: ''کل یہ لوگ قطار باندھ کر میرے مکان کے سامنے سے جا رہے تھے۔ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا''

اسی اثنا میں سیوتی تازہ خبر لائی

برجن: ''کوئی نئی خبر ہے؟''

سیوتی: ''ہاں بالا جی مانک پور آئے ہیں۔ ایک اہیر نے اپنی لڑکی کی شادی کا نوید بھیجا تھا، اس پر الہ آباد سے ارجن سبھا کے ممبروں کے ساتھ راتوں رات بانک پور پہنچے۔ اہیروں نے بڑے جوش سے خیر مقدم کیا۔ اور مل کر پانچ سو گائیں انہیں

بھینٹ دیں۔ بالا جی نے دلہن کو دعا دی اور دولہا کو گلے لگایا۔ پانچ اہیر ارجن سبھا کے ممبر بن گئے''

برجن: ''نہایت دلچسپ خبر ہے۔ مادھوی اسے کاٹ کر رکھ لینا اور کچھ؟''

سیوتی: ''پٹنہ کے باسیوں نے ایک ٹھاکر دوارہ بنوایا ہے۔ پٹنہ کی ارجن سبھا نے بڑی دھوم دھام سے اس کا جلدہ کیا''

برجن: ''پٹنہ کے لوگ خوب سرگرمی سے کام کر رہے ہیں''

چندر کنور: ''کیا سوریں بھی اب سیندور پہنیں گی۔ باسی ٹھاکر دوارے بنوائیں گے''

رکمنی: ''کیوں وہ آدمی نہیں ہیں، ایشور نے انہیں نہیں بنایا۔ آپ ہی اپنے مالک کی پوجا کرنا جانتی ہیں''

چندر کنور: ''چلو ہٹو باسیوں سے مجھے ملاتی ہو، یہ مجھے اچھا نہیں لگتا''

رکمنی: ''ہاں تمہارا رنگ ذرا صاف ہے اور گہنے کپڑے سے لیس ہو۔ بس اتنا ہی فرق ہے کہ کچھ اور؟''

چندر کنور: ''اتنا ہی فرق کیوں ہے، زمین کو آسمان سے ملاتی ہو۔ میں کچھوا ہوں کے خاندان میں ہوں، معلوم ہے!''

رکمنی: ''ہاں معلوم ہے اور نہیں معلوم تھا تو اب معلوم ہو گیا۔ ٹھاکر صاحب کسی باسی سے بدبدکر کشتی لڑیں گے یا سر پر ٹیڑھی پگیا ہی رکھنا جانتے ہیں۔ میں تو جانتی ہوں کہ معمولی باسی بھی انہیں بغل میں دبا لے گا''

چندر کنور: ''منہ میں زبان دے جو چاہے کہہ لو، ہمارے باوا جے پور میں صوبیدار تھے۔ ہم لوگوں کی بیر تا دنیا میں مشہور ہے''

برجن: ''اچھا اب اس قضیہ کو جانے دو۔ تم دونوں جب آتی ہو لڑتی ہی آتی ہو''

ایک مہینہ اور گزرا۔ برجن کی تازہ نظم خیر مقدم کا پیغام لے کر بالا جی کے پاس پہنچی